بہاولپور تاریخ کے آئینے میں

محمد سلیم احمد

آج کا بہاولپور ۱۹۷۰ء میں ملک میں ہونے والی سیاسی و انتظامی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے ، لیکن اس کی حدود کم و بیش آج بھی وہی ہیں ، جو تقریباً دو سو سال قبل متعین کی گئی تھیں ، جب اس کی حیثیت ایک آزاد و خود مختار ریاست کی تھی ۔ اس کے حکمران اپنے آپ کو عباسی کہتے تھے ، اور اپنا تعلق حضرت عباس سے بتاتے ہیں جو داعی اسلام اور آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک چچا تھے ۔ بہاولپور کی ریاستی حیثیت ۱۹۵۵ء تک قائم رہی ۔ اس کے بعد اس علاقے کو پہلے پاکستان کی وحدت میں ضم کیا گیا ، بعد ازاں ، جب ۱۹۷۰ء میں یہ وحدت ختم ہوئی اور پاکستان کو نئے انتظامی سانچے میں ڈھالا گیا تو یہ ایک انتظامی ڈویژن کی صورت میں ابھر کر سامنے آیا ۔ موجودہ حیثیت وہی صورت اختیار کیے ہوئے ہے ۔

بہاولپور کے حکمرانوں کی ابتدائی تاریخ زمانے کے گرد کی تہہ میں دبی ہوئی ہے ، اور جو کچھ ان کے خاندانی حالات کے بارے میں کہا اور لکھا گیا ہے وہ حقیقت سے بعید معلوم ہوتا ہے اس دور کی تاریخ لکھنے والوں نے حالات کو اور بھی گنجلک بنا دیا ہے ، کیونکہ بہت سے غیر حقیقی واقعات کو تاریخی بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ، جس کی وجہ سے اس خاندان کے ابتدائی حکمرانوں کی تاریخ قصہ گوئی اور قصیدے کی شکل اختیار کر گئی ہے ، مثلاً صبح صادق کے مصنف نے رسول اکرمؐ سے منسوب ایک حدیث کی نقل کی ہے جو بہاولپور کے عباسی حکمرانوں کی حکومت کو لازوال ثابت کرتی ہے ، پس مصنف کا کہنا ہے کہ رسولؐ کی حدیث ہے کہ " عباسی سلطنت قیامت تک رہے گی ۔ "[۱] اسی طرح تواتر سے بہاولپور کی تاریخ لکھنے والوں نے یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اس خاندان کے ایک سربراہ چنی خان نے ملتان جا کر مغل بادشاہ اکبر (۱۵۵۶ء ۔ ۱۶۰۵ء) کے بیٹے شہزادہ مراد (۱۵۷۰ء ۔ ۱۵۹۹ء) سے ملاقات کی جس کے نتیجے میں شہزادہ مراد نے چنی خان کو جام کا خطاب اور پنج ہزاری عہدہ عطا کیا[۲] ۔ اس ملاقات کی تفصیل بھی ایسے انداز میں بیان کی گئی ہے جو

کہانی زیادہ اور حقیقت کم معلوم ہوتی ہے [۳]۔ موجودہ لکھنے والوں نے بھی اس واقعہ کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ رفیق احمد صدیقی نے اپنے حال کے ایک مضمون میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ ٹھوس تحقیقی اندازے کے مطابق ۱۴۰۰ء میں امیر چنی خان عباسی کو اکبر اعظم کے بیٹے شہزادہ محمد مراد نے سندھ میں سیوستان اور مضافات کا علاقہ بطور جاگیر بخش دیا، اور امیر چنی خان نے ان علاقوں میں اپنی حکومت قائم کرلی [۴] اس "ٹھوس تحقیقی" دعوے کی تاریخی حیثیت کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جاسکتا ہے کہ ۱۴۰۰ء میں تو مغل حکومت کا قیام بھی عمل میں نہیں آیا تھا [۵]۔

اپنی علمی بصیرت اور معاملہ فہمی کا کچھ ثبوت بعض عباسی حکمران بہاولپور نے بھی دیا ہے، اس کا اندازہ ان حکمرانوں میں ایک بہاول خان دوئم (۱۸۰۹-۱۷۷۲ء) کے دور میں ہونے والے ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں چند افراد پر مشتمل انگریزوں کا ایک گروہ کابل جاتے ہوئے بہاولپور سے گزرا اور یہاں کچھ عرصہ قیام بھی کیا، بہاول خان دوئم نے ان کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ حتیٰ کہ علاقے کے تاجروں اور دوکانداروں کو آگاہ کردیا کہ اس گروہ کے ارکان سے، اگر وہ کچھ خرید کریں، کوئی قیمت نہ لی جائے۔ بہاول خان کے مشیروں میں سے کچھ کو یہ بات پسند نہ آئی اور کچھ دوسروں نے ناراضگی کا اظہار بھی کیا۔ اس کے جواب میں بہاول خان نے جو کچھ کہا وہ قابل غور بھی ہے، اور قابل حیرت بھی۔ اس نے کہا [۶]۔

> گو ہمیں اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچے لیکن ہمارے جانشین یقیناً ہمارے اس فیصلے سے مستفید ہونگے، کیونکہ قرآن میں لکھا ہے کہ فرنگی کی طاقت پورے ملک میں پھیل جائے گی۔

جہاں تک بہاولپور کے حکمرانوں کا خاندان بنو عباس سے رشتہ کا تعلق ہے تو اس دعوے کے تعلق کی کڑیاں اتنی ہی کمزور ہیں جس طرح اسماعیلی فرقے کے بانی آغا خان کا اپنے خاندان کا بنو فاطمہ سے تعلق کا دعویٰ جو حقیقت کے برعکس ہے [۷]۔

اس حقیقت کے برعکس کہ حکمرانان بہاولپور کا تعلق خاندان بنو عباس سے ہے، زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ خالص مقامی لوگ ہیں۔ اس خاندان کا سربراہ، داؤد جسکی مناسبت سے یہ "داؤد پترے" کہلائے، موجودہ شکارپور، سندھ کے علاقے کا رہنے والا تھا، پیشے کے اعتبار سے داود جولاہا تھا اس کے پانچ بیٹے تھے۔ عارب یا عرب، عباس، حسین، حاسب اور قاسم۔ ان ہی سے خاندانوں کے

سلسلے چلے اور عارب ، عربانی ، عباس ، عباسی ، حسین ، حسینی ، حاسب ، حسانی ، اور قاسم کہرانی (Kehranee) یا قہرانی داؤد پوترا کہلائے ۔

جیسے جیسے خاندان کے افراد میں اضافہ اور ان کی معاشی حالت بہتر ہوتی گئی ، ویسے ویسے یہ لوگ ترقی کرتے چلے گئے اور کپڑا بننے کے خاندانی پیشے کو چھوڑ کر دوسرے پیشے بھی اختیار کرنے لگے اس دوران انہوں نے جنگجویانہ صلاحیتیں بھی پیدا کیں اور ہتھیاروں کا استعمال کرنا بھی سیکھا ۔ ان میں سے کچھ نے ملتان اور ٹھٹھہ کے حاکموں کے ہاں نوکری بھی حاصل کر لی ۔ یہ حاکم یا ناظم بذات خود دہلی کے مغل شہنشاہوں کے نوکر تھے ۔

داؤد پوتروں کے خاندان کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ملتان اور شکارپور میں مقیم رہی ۔ ایک عرصہ تک ان کا پیشہ اس علاقے سے گزرنے والے قافلوں پر حملہ کرنا اور ان کو لوٹنا تھا ۔ غالباً یہ سلسلہ مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر (۱۷۰۷ء ۔ ۱۶۵۸ء) کی حکومت قائم ہونے سے قبل تک چلتا رہا تاآنکہ اورنگزیب کے دور حکومت میں عباسیوں یا داؤد پوتروں کی حیثیت کچھ واضح ہو کر سامنے آنے لگی ۔

اورنگ زیب کے دور حکومت میں معزالدین جہاندار شاہ (پیدائش ۱۶۶۳ء) جو اول الذکر کا پوتا تھا ملتان کا ناظم (۱۷۰۷ء ۔ ۱۶۹۹ء) تھا ، اس کی نظامت کے دوران بلوچوں نے دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر شورش برپا کی جس کے نتیجے میں اسے ان کے خلاف فوجی مہم میں تربیت دینا پڑی ۔ عین اس وقت جب معزالدین اپنی مہم میں مصروف تھا ۔ داؤد پوتروں کا ایک سربراہ شہزادہ کے پاس ٹھٹھہ کے حاکم کی زیادتیوں کی شکایت لے کر آیا ۔ شکایت کرنے والے کا نام مبارک خان بتایا جاتا ہے [۸] ، ابھی مبارک خان کی شکایت کا ازالہ بھی نہ ہوا تھا کہ باغی بلوچوں نے شہزادہ معزالدین کی قیام گاہ پر شب خون مارا ، شہزادہ کے اپنے سپاہی اس حملے کو روکنے میں ناکام رہے ، لیکن مبارک خان نے اس موقعے پر اپنے ساتھیوں کی مدد سے حملہ آوروں کو مار بھگایا ۔ اس خدمت کے صلے میں شہزادہ معزالدین نے مبارک خان کو شکارپور کے آس پاس کا علاقہ انعام میں دے دیا ۔ اس واقعہ کے بعد داؤد پوتروں کی بابت کچھ زیادہ معلوم نہیں تاہم ان کا دوبارہ تذکرہ نادر شاہ (۱۷۴۷ء ۔ ۱۷۳۶ء) کے حملہ ہندوستان (۱۷۳۹ء) کے دوران ملتا ہے ، جب اس نے سندھ پر بھی فوج کشی کی ۔

جس وقت نادر شاہ سندھ پہنچا وہاں کلہوڑہ خاندان کا قبضہ تھا اور نور محمد کلہوڑہ (۱۷۵۳ء - ۱۷۱۹) اس حکومت کی بنیاد کچھ عرصہ قبل ہی یار محمد کلہوڑہ (۱۷۱۹ء - ۱۷۰۰ء) نے رکھی تھی۔ جس وقت سندھ پر نور محمد کلہوڑہ حاکم تھا۔ اس کا ہم عصر صادق محمد خان اول (۱۷۴۶ء - ۱۷۲۷ء) پسر مبارک خان (وفات ۲۶-۱۷۲۵) خاندان داؤد پوترہ کا سب سے بااثر شخص تھا۔ مبارک خان نے اپنی وفات سے چند سال قبل ہی صادق کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ نور محمد کلہوڑہ کو داؤد پوتروں کا بڑھتا ہوا اثر رسوخ بالکل پسند نہ تھا۔ داؤد پوتروں کی سندھ کے حاکموں سے ان بن مبارک ہی کے زمانے سے چلی آرہی تھی۔ اس کا ذکر پہلے اوپر ہو چکا ہے۔ اب صادق محمد خان بھی اس ان بن کا شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ نور محمد کلہوڑہ اسے سندھ کے ان علاقوں سے نکالنے کے درپے تھا جو صادق کے باپ مبارک کو شہزادہ معزالدین نے عطا کیے تھے۔ نور محمد کو اس میں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی اور صادق کو سندھ خالی کرنا پڑا۔

اس خراب صورت حال میں صادق محمد خان کی دو اطراف سے کافی حوصلہ افزائی ہوئی جس کے نتیجے میں داؤد پوتروں یا عباسیوں کی سیاسی اہمیت کو قوت حاصل ہوئی۔ صادق محمد خان جب سندھ سے جلا وطن کیا گیا تو ڈیرہ غازی خان کے ایک غیر معروف علاقے میں پناہ لی، مقصد سندھ کے کلہوڑوں کی زیادتیوں سے بچنا تھا۔ حالت بے سروسامانی کی سی تھی، کہ اُچ کے گیلانی خاندان کے سربراہ شیخ عبدالقادر نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ اس کے ساتھ ہی شیخ نے ملتان کے گورنر (۴۸-۱۷۴۷ء) حیات اللہ خان یا شاہ نواز خان سے بھی صادق محمد خان کی سفارش کی۔ اس کے نتیجے میں حیات اللہ خان نے اُچ کے قرب وجوار میں ایک قطعہ اراضی صادق محمد خان کو بطور جاگیر عطا فرمایا۔ اس جگہ کا نام "چودھری" تھا جو آج "لیاقت پور" کے نام سے مشہور ہے یہاں سے کچھ فاصلے پر ہی صادق محمد خان نے اپنی رہائش کیلئے ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی، جس کا نام اس نے "الہ آباد"[9] رکھا۔ یہ جگہ لیاقت پور سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر آج بھی موجود ہے۔ آخر الذکر واقعہ کمزور شہادت پر مبنی ہے، کیونکہ حیات اللہ ۴۸-۱۷۴۷ء میں ملتان کا حاکم تھا اور الہ آباد کی تعمیر کی تاریخ ۱۷۲۸ء بتائی جاتی ہے[10]۔

جس دوران صادق محمد خان اپنے آبائی علاقے سے نکل کر حالات ٹھیک کرنے میں مشغول

تھا، نادر شاہ سندھ پر حملہ آور ہوا۔ نور محمد کلہوڑہ کو نادر شاہ نے شکست دی جس کے نتیجے میں وہ معافی کا خواستگار ہوا۔ اس دوران صادق محمد نے بھی نادر شاہ سے ملاقات کی اور غالباً اپنے مصائب اور نور محمد کلہوڑہ کی زیادتیوں کا بھی ذکر کیا۔ نادر شاہ نے صادق محمد سے ہمدردی کا سلوک کیا، اس نے سندھ کی فتح کے بعد اس کی تقسیم کچھ اس طرح کی کہ صادق محمد خان کو اس کا آبائی علاقہ جس میں شکارپور بھی شامل تھا، اسے واپس کر دیا۔ اور باقی علاقہ نور محمد کلہوڑہ کو دے کر سندھ میں اسے اپنا نائب مقرر کر دیا۔ اب سندھ کے معاملات براہ راست ایرانی حکمران کے زیر اثر آگئے اور عباسی یا داؤد پوترہ براہ راست اس سے منسلک ہوگئے، لیکن اس تقسیم سے جو نادر شاہ نے کی تھی نور محمد کلہوڑہ کچھ زیادہ خوش نہیں ہوا، لہذا نادر شاہ کی واپسی کے بعد اسے صادق محمد خان داؤد پوترہ کو اس علاقے سے بے دخل کرنے کے لیے اسے ہراساں کرنا شروع کر دیا۔ حالات کو سلجھانے کی خاطر صادق محمد خان خود نادر شاہ کے دربار پہنچا اور واقعات کی صحیح صورت حال بیان کی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے نادر شاہ اس کی وضاحت سے مطمئن نہیں ہوا۔ تاہم اس نے کلہوڑوں اور داؤد پوتروں کے جھگڑے کو ختم کرنے کی ایک تدبیر سوچی وہ یہ کہ آخر الذکر کو برصغیر کے علاقے سے کہیں اور منتقل کر دیا جائے۔ چنانچہ صادق محمد خان کے لیے، جو دربار نادری میں موجود تھا، تجویز ہوا کہ اپنے موجودہ مقبوضات کو چھوڑ کر وہ افغانستان منتقل ہو جائے جہاں اسے اور اس کے خاندان والوں کو غزنی کا علاقہ بطور جاگیر دینا منظور ہوا"۔

بہاولپور کے حکمرانوں کی تاریخ یقیناً کچھ اور ہوتی اگر صادق محمد خان نے نادر شاہ کے فیصلے پر من و عن عمل کر لیا ہوتا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ کیونکہ جب وہ یہ حکم لے کر واپس شکارپور پہنچا تو اس کے قبیلے اور خاندان کے افراد نے افغانستان جانے کی تجویز کو رد کر دیا۔ نادر شاہ نے ان کو غزنی منتقل کرنے کے لیے فوجی اقدامات سے بھی گریز نہ کیا۔ اس کے نتیجے میں صادق محمد خان اور نادر شاہ کے فوجی افسر مرزا عسکر علی کے درمیان جنگ بھی ہوئی جس میں صادق خان مارا گیا، اور اس کا ایک بیٹا مبارک بھی زخمی ہوا۔ اسی دوران نادر شاہ کا بھی ایران میں انتقال ہو گیا۔ اس کی حکومت انتشار کا شکار ہوئی، جس کے نتیجے میں اس کے ایک فوجی افسر احمد شاہ (۱۷۷۳ء۔۱۷۴۷ء) ابدالی یا درانی نے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے افغانستان میں آزاد حکومت قائم کر لی۔ اب ہندوستان کے معاملات

بھی ایرانی اثر سے نکل کر افغانی حکمران کے زیر اثر آگئے۔

صادق محمد کی وفات کے بعد خاندان کے لوگوں نے اس کے تین بیٹوں میں سے ایک بہاول خان اول (۱۷۴۹ء۔۱۷۴۶ء) کو اس کا جانشین چن لیا۔ بہاول خان کے عہد کا ایک کارنامہ بہت اہم ہے اور وہ ہے "بہاولپور" کے نام سے ایک نئے شہر کی بنیاد جس کی وجہ سے اس پورے علاقہ کو یہی نام ملا۔ اس لحاظ سے یہ واقعہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ آج بھی یہ جگہ بہاولپور کے نام سے ہی جانی پہچانی جاتی ہے۔ بہاولپور شہر کی بنیاد دریائے گھارا یا گارا (جس کے معنی پرانا یا بوڑھے کے ہیں) کے قریب رکھی گئی، گارا دریائے ستلج کا مقامی نام ہے۔ جو آج بھی شہر کے قریب سے گزرتا ہے، گو اب اس کی اہمیت وہ نہیں رہی جو کچھ دہائیوں قبل تھی۔ اس کی وجہ اس میں پانی کی کمی ہے۔ کبھی یہ دریا پایاب ہوا کرتا تھا۔ بہاول خان نے جس جگہ بہاولپور شہر کی بنیاد رکھی اس وقت یہ بڑی حد تک بے آب و گیاہ میدان تھا۔ یہاں وڈیرہ محمد پناہ گھمرانی کی مختصر رہائش گاہ جسے "کوشک" یا "ککھ" (Kakh) کہتے تھے، تعمیر تھی [12]۔ قرب وجوار میں جانوروں کے رکھنے کی جگہ جسے "جھونک" کہتے تھے، بنی ہوئی تھیں [13]۔ بہاول خان نے اس جگہ کو مرکزی سمجھتے ہوئے شہر بہاولپور بسایا۔ یہ وہ فیصلہ تھا جو صحیح ثابت ہوا اور اس کی دور اندیشی کو ظاہر کرتا ہے۔ شہامت علی کے مطابق بہاول خان اول دس سال تک حاکم رہا [14]۔ لیکن دوسرے تاریخی شواہد سے اس کا دور حکومت چار سال سے زائد نہیں ملتا [15]۔

بہرحال بہاول خان اول کو نہ صرف بہاولپور شہر کا بانی ہونے کا شرف حاصل ہے، بلکہ ہر اعتبار سے عباسیوں یا خاندان داؤد پوتروں کا سردار اور حاکم بھی، حقیقت یہ ہے کہ اس کے زمانے سے ہی بہاولپور حکومت کی بنیاد رکھی گئی۔ تاہم یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ بہاولپور شہر کی بنیاد کب پڑی لیکن عزیز الرحمان کے مطابق یہ واقعہ بہاول خان کی وفات سے ایک سال قبل، یعنی ۱۷۴۸ء کا ہے [16]۔

بہاول خان اول کی وفات کے بعد اس کا بھائی مبارک خان دوئم (۱۷۴۹ء۔۱۷۷۲ء) جانشین ہوا اس کا دور کافی عرصہ پر محیط ہے تاہم اسے اپنے دور میں جن مشکلات سے گزرنا پڑا ان میں سے ایک افغان حکمران احمد شاہ ابدالی سے نبرد آزما ہونا تھا۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ نادر شاہ درانی کی وفات کے

بعد احمد شاہ ابدالی نے افغانستان میں اپنی خود مختار حکومت قائم کرلی تھی ۔اور یہ کہ اس تبدیلی کی وجہ سے ہندوستان ایرانی اثر سے نکل کر افغان حکمرانوں کے زیر اثر آگیا تھا۔بہاولپور کے عباسی اس اثر سے مستثنیٰ نہیں تھے۔یہی وجہ ہے کہ مبارک خان دوئم کو بھی افغانیوں سے نبرد آزما ہونا پڑا تھا۔ اختلاف کی بڑی وجہ داؤد پوتروں یا عباسیوں کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ تھا۔ مبارک خان کا دور چونکہ بیس سال سے زائد عرصہ پر محیط ہے، اس لیے یہی خیال کیا جاسکتا ہے کہ شروع ہی سے اس نے اپنے معاملات کو خوش اسلوبی سے حل کیا، جس کے سبب نہ صرف اس کے محکومہ علاقے میں توسیع ہوئی بلکہ اس کی خاندانی حیثیت کو استحکام بھی حاصل ہوا۔ یقینی بات ہے کہ افغان حاکم احمد شاہ کو یہ بات ناگوار گذری ہوگی ۔ایسی صورت میں جبکہ اسکی نظریں ہندوستان پر لگی ہوئی تھیں، اسے یہ پسند نہ آیا ہوگا کہ افغانستان کے قرب کا ہندوستانی علاقہ اتنا مستحکم ہوجائے کہ اس کی مہمات ہند میں رکاوٹ کا سبب بن جائے ۔چنانچہ ۱۷۵۱ء میں اس نے اپنے ایک فوجی افسر سردار جہان خان کو مبارک خان کے خلاف بھیجا۔دونوں میں جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں افغانیوں کو ہزیمت اٹھانا پڑی، لال سوہانرا تک مبارک کی فوج نے ان کا تعاقب کیا۔سردار جہان نے حالات سے مجبور ہو کر صلح کرلی۔

مبارک خان دوئم کے دور میں لاہور اور اس کے گرد و نواح میں سکھوں نے طاقت پکڑنا شروع کی، جس کے کچھ عرصہ بعد ہی بہاولپور کا علاقہ بھی ان کی مہمات کی زد میں آگیا۔فوجی اہمیت کے علاوہ مبارک خان دوئم کے عہد کی ایک سیاسی اہمیت بھی ہے ۔جو بہاولپور کی آزاد نہ حیثیت کی نشاندہی کرتی ہے ۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مبارک خان نے ملتان و ڈیرہ غازی خان کے حاکموں کے علاوہ احمد شاہ ابدالی کے پاس اپنے سفیر روانہ کیئے [۱۷]۔اس نے سکھوں سے مسلسل خطرہ کے پیش نظران کے اور اپنے درمیان سرحد کے تعین کا معاملہ بھی طے کیا، جسکے مطابق پاک پتن دونوں کے درمیان حد فاصل قرار پایا ۔اپنے علاقے کی بہتری اور ترقی کیلئے بھی مبارک نے خدمات انجام دیں، ان میں ایک اہم انتظامی خدمت یہ تھی کہ زراعت کے فروغ کے لیے کئی نہریں کھدوائیں جو مبارک واہ سردار واہ نینی واہ اور خان واہ کے نام سے مشہور ہوئیں ۔ باوجود ترقی اور استحکام کے مبارک خان کو اپنے خاندان کے دیگر قبیلوں سے بھی جنگ کرنا پڑی ۔ان

میں سے خمرانی اور کہرانی سرداروں نے، جو عباسیوں یا داؤدپوتروں کی ہی شاخ تھے، مبارک کو کافی پریشان کیا جس کی وجہ سے اکثران لوگوں کے خلاف ہتھیار اٹھانا پڑے جسکے نتیجے میں ان قبائل کو شکست سے دوچار ہونا پڑا [۱۸]۔ لیکن یہ قبائل زیادہ تر آزاد ہی رہے اور مبارک کا دور ایک طرح سے آزاد ریاستوں کا مجموعہ تھا۔ اس مجموعے میں عباسی خاندان ہی کے، مخالفین شامل تھے اور بڑی حد تک آزاد ان کے نام یہ ہیں۔ پیرجانی، کہرانی یا قہرانی، عربانی، ھالانی، منڈھانی اور محروفانی۔ یہ سب خاندان عباسی ہی سے تعلق رکھتے تھے [۱۹]۔

مبارک خان دوئم کا انتقال ۱۷۷۲ء میں ہوا۔ کیونکہ وہ لاولد تھا۔ لہذا اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بھتیجے جعفر خان (پیدائش ۔۱۷۵۲ء) کی تربیت اس طرح کی تھی کہ اس کی جانشینی میں کسی کو شبہ نہ رہا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مگر جانشین ہونے پر جعفر خان نے بہاول خان کا خطاب اختیار کیا۔ اس نام سے خاندان میں یہ دوسرا سربراہ تھا۔ اس لئے بہاول خان دوئم کے نام سے حکمرانی (۱۸۰۹۔۱۷۷۲ء) کی۔

مبارک خان دوئم کی وفات کے وقت افغانستان اور سندھ میں بھی حکمرانوں کی سطح پر تبدیلیاں آئیں۔ چنانچہ جس وقت مبارک کا انتقال ہوا تقریباً اسی دوران افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کی وفات واقع ہوئی اور اس کی جگہ اس کا بیٹا تیمور شاہ (۱۷۸۳ء۔۱۷۷۲ء) حاکم بنا۔ سندھ میں بہاولپور کے مخالف کلہوڑا خاندان کی حکمرانی تھی اور مبارک کے دور میں میاں غلام شاہ کلہوڑا (۱۷۷۳ء۔۱۷۵۶ء) حاکم تھا۔ اس کا بھی اسی دوران انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا سرفراز خان حاکم بنا۔ سندھ جلد ہی بدامنی کا شکار ہوگیا۔ یکے بعد دیگرے کئی حکمران آئے لیکن سندھ کو استحکام حاصل نہ ہو سکا، تاآنکہ کلہوڑوں کی نااہلی اور ظلم سے تنگ آکر ایک نئے خاندان نے، جو بلوچی تالپور کے نام سے مشہور ہوا، کلہوڑوں کے خلاف بغاوت کر کے ۱۷۸۴ء میں سندھ میں تالپور حکومت کا سنگ بنیاد رکھا [۲۰]۔

افغانستان بھی جلد ہی بدامنی کا شکار ہوگیا۔ وہاں تیمور شاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں اور سرداروں میں جانشینی کے مسئلے پر جھگڑا پیدا ہوا جس کے نتیجے میں ملک کمزور ہوتا چلا گیا، پھر جلد ہی ہندوستان میں انگریزوں کی بڑھتی قوت کا شکار ہوگیا۔ لیکن بہاولپور کے نئے حاکم بہاول خان دوئم

کی حکمت عملی نے نہ صرف اس کے مقبوضات کو استحکام بخشا، بلکہ وہ خود بھی آزاد و خود مختار حاکم بن کر سامنے آیا۔

بہاول خان دوئم کا دور (۱۸۰۹ء ۔ ۱۷۷۲ء) در حقیقت ریاست بہاولپور کی تشکیل اور قیام کا دور ہے۔ لہذا بہاول خان دوئم کو اس کا پہلا حاکم تصور کرنا بے جا نہ ہوگا۔ اس سے قبل اس خاندان کے سربراہ کی حیثیت واجبی سی ہی تھی۔ کیونکہ ہر چہار اطراف سے یہ دوسروں کے تابع تھے۔ ان کے حاکموں میں ایرانی بھی شامل رہے اور افغانی بھی۔ یہ دربار دہلی کی طرف سے ملتان میں متعین صوبہ داروں کے زیر اثر بھی رہتے تھے، اور سندھ کے کلہوڑہ حکمران بھی ان کو دبائے رکھتے تھے۔ اس دوران جیسلمیر کے ہندو حکمران اور پنجاب کے سکھ حکمرانوں نے بھی ان پر اپنا دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ پھر خاندان عباسی کے طاقتور گروہ بھی ان کی مصیبت کا باعث بنے رہتے تھے۔ لیکن بہاول خان دوئم کے دور میں بہت کچھ تبدیلی واقع ہوئی، جو ریاست بہاولپور کے قیام کی واضح نشاندہی کرتی ہے، بہاولپور کی یہ حیثیت قیام پاکستان کے چند سال بعد تک قائم رہی۔

بہاول خان دوئم نے جس وقت عنان حکومت سنبھالی اس وقت بہاولپور کو مختلف اطراف سے خطرات کا سامنا تھا۔ اس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے پھر اس کے مخالفین میں اچ کے مخدوم حامد گیلانی کا بھی اضافہ ہو گیا۔ مخدوم حامد گیلانی کی ناراضگی کی وجہ اس کی ایک قیمتی تلوار کی چوری تھی، جس کا الزام اس نے بہاول خان دوئم کے آدمیوں پر لگایا۔ اپنی شکایت کے ازالے کے لیے حامد گیلانی نے بہاول خان کے خلاف افغان حکمران کی بھی مدد چاہی۔

افغانستان کے حکمران تیمور شاہ کو خود بھی ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش تھی۔ سندھ کے حاکم غلام شاہ کی وفات کے بعد وہاں اس کے بیٹوں میں جانشینی کے مسئلہ پر چپقلش شروع ہو چکی تھی اور ان میں سے ایک عبدالنبی خان نے تیمور کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اس کے دربار میں بھی حاضری دی۔ اب مخدوم حامد گیلانی نے بھی بہاول کے خلاف تیمور کی مدد چاہی۔ چنانچہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تیمور نے پہلے بہاولپور کے خلاف اپنے ایک سردار مدد خاں درانی کو فوج دے کر بھیجا۔ مقصد اس کا بہاول خان دوئم کو سزا دینا تھا مدد خان نے ۱۷۸۵ء میں بہاولپور پر حملہ کیا اور شہر کو تہہ و بالا کر دیا۔ اس نے بہاول کے بیٹے مبارک خان

(پیدائش ۱۷۷۲ء) کو بھی یرغمال بنالیا اور کابل بھیج دیا۔ جہاں اسے ایک سال تک رکھا گیا۔ مدد خان کی دستبرد سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے بہاول خان نے اسے ۔/ ۶۶۰۰۰ روپیہ کی رقم ادا کی [۲۱]۔ کچھ عرصے کے بعد ۱۷۸۸ء میں تیمور خود بھی بہاولپور پر حملہ آور ہوا اور شہر کو لوٹ مار کا نشانہ بنایا۔ اس مرتبہ بہاول خان نے تحفے تحائف دیکر افغانیوں سے نجات حاصل کی [۲۲]۔

دوسری طرف پنجاب کے سکھ حاکم رنجیت سنگھ (۱۷۹۹ء۔۱۸۳۹ء) کی بڑھتی ہوئی طاقت نے بھی بہاولپور کے لیے خطرات پیدا کر دیے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سکھوں کی طاقت کو روکنے والا اس علاقے میں کوئی نہ تھا، اگرچہ افغانستان کے حکمران یہ کام کر سکتے تھے لیکن تیمور کی وفات کے بعد جانشینی کے جھگڑے نے آپس کی لڑائیوں کو جنم دیا جس کی وجہ سے افغان حکومت مسلسل کمزور ہوتی چلی گئی۔ اور سکھ طاقت ان پر بھی حاوی ہو گئی۔ ایسے میں بہاول خان کو بہت احتیاط سے قدم اٹھانے کی ضرورت تھی اور اس نے ایسا ہی کیا۔ چنانچہ جب ۱۸۰۷ء میں رنجیت سنگھ نے ملتان پر حملہ کیا تو ایک طرف تو بہاول خان نے وہاں کے حاکم مظفر خان کو اپنی مدد کا یقین دلایا، اور دوسری طرف رنجیت سنگھ کو اپنے ہندو سیکریٹری دھنپت رائے کے ذریعہ قیمتی تحائف بھیجے۔ رنجیت سنگھ کا ملتان کا محاصرہ طول کھینچ گیا۔ جس کی وجہ سے اس نے واپسی کا ارادہ کیا۔ اس موقع پر بہاول خان نے رنجیت سنگھ کے سیکرٹری فقیر عزیز الدین کے ذریعہ قیمتی تحائف کا نذرانہ روانہ کیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد فقیر عزیز الدین کے بھائی امام الدین نے بھی بہاول خان دوئم سے ملاقات کی اور رنجیت سنگھ کی طرف سے دوستی کا پیغام دیا [۲۳]۔

بہاولپور کے حکمران کے خلاف عباسی داؤد پوترے بھی عرصے سے خطرہ بنے ہوئے تھے اور مضبوط و مستحکم حکومت کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا سبب تھے، بہاول خان دوئم نے انہیں بھی زیر کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے لیے اس نے جو حکمت عملی اپنائی وہ دو طرح کی تھی۔ اولاً با اثر داؤد پوتروں کو اپنے علاقے کے نظم و نسق میں شامل کر کے انتظامی ذمہ داریاں سونپنا اور دوئم شادی کے ذریعہ تعلقات استوار کرنا۔ ان ہر دو اقدام سے اسے کافی فائدہ پہنچا، اور اس کے زیر اثر علاقے کو استحکام بھی حاصل ہوا۔

جہاں تک با اثر افراد کو اپنی حکومت میں شامل کرنے کا تعلق ہے تو بہاول خان نے جان محمد

اور اس کے بھائی نور محمد کو وزارت کی ذمہ داریاں سونپی ۔ کچھ دوسرے لوگوں پر مشتمل ایک مشاورتی کونسل بنا کر انہیں حکومت کے کاموں میں مشغول کر دیا [۲۴] ۔یوں بہاولپور میں پہلی بار بہاول خان دوئم نے وزارتی اور مشیروں کی سطح پر نامزدگی کر کے انتظامی نظم و نسق کو نئے دور میں داخل کیا ۔ علاوہ ازیں دیوان لال داس کو جو خاندان کا پرانا خدمت گار تھا، مختار مقرر کیا ۔ اس نے کئی شادیاں بھی کیں جو سیاسی اعتبار سے اہم ثابت ہوئیں ۔ ۱۷۶۹ء میں فیروزانی قبیلے کے سربراہ کہنہ خان کی لڑکی سے شادی کی ۔ ۱۷۸۰ء میں برجانی قبیلے کے سربراہ محمد خان برجانی کی لڑکی سے اور اس کے فوراً بعد محبت خان کی لڑکی سے آخر الذکر پیرجانی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اور احمد پور شرقیہ کے علاقہ پر قابض تھا ۔ شادی کے بعد یہ علاقہ بہاول خان کو جہیز میں مل گیا ۔ کچھ ہی عرصہ بعد چوتھی شادی ملیسیوں (میلسی) کے سردار جون خان داؤد پوترہ کی لڑکی سے کی ۔ سیاسی اور فوجی حکمت عملی کے علاوہ شادیوں کے ذریعہ بہاول خان نے اپنے علاقے کی توسیع اور استحکام کے لیے اہم خدمات انجام دیں ۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ بہاول خان دوئم نے بہاولپور میں ایک ایسے وقت انتظامی ذمہ داریاں سنبھالی تھیں جب باقی ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت کا شیرازہ بکھر رہا تھا ۔ پنجاب پہلے ہی دہلی کی مرکزی حکومت کے قبضے سے نکل کر سکھوں کے زیر اقتدار آچکا تھا ۔ بنگال، دکن اور اودھ میں بھی خود مختاری کا دور دورہ تھا، ان صوبوں میں مرکزی حکومت کی طرف سے مقرر کردہ صوبہ داروں نے اختیار سنبھال کر خود کو آزاد تصور کرنا شروع کر دیا تھا ۔ رہے سہے باقی علاقوں میں بھی بادشاہ دہلی کا اثر و رسوخ نہ ہونے کے برابر تھا اس کی بڑی وجہ جنوبی ہند سے اٹھنے والی مرہٹوں کی طاقت تھی جس نے بادشاہ دہلی کو اپنا مطیع بنا کر اسے مفلوج کر دیا تھا ۔ اس کی بدترین مثال بادشاہ شاہ عالم ثانی (۱۷۵۹ء ۔ ۱۸۰۶ء) کے دور میں دیکھی جا سکتی ہے ۔ اس سے قبل نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے ہندوستان کی مسلمان حکومت کو ہلا کر رکھ دیا تھا ۔

ملک کی بگڑتی ہوئی حالت سے اگر کسی نے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا تو وہ یورپ کی انگریز قوم تھی ۔ انگریزوں نے اپنی حکمت عملی اور فوجی طاقت کے بل پر نہ صرف شاہ عالم بادشاہ کو مرھٹوں کے اثر سے آزاد کرایا، بلکہ اسے اپنا غلام بھی بنا لیا ۔ یہی وہ وقت ہے جب انگریزوں نے

افغانستان پر بھی نظریں گاڑ دیں۔ اس کی بڑی وجہ روسی اور یورپی سیاست تھی، جو انگریزوں کے خلاف وسط ایشیا اور افغانستان کے راستے ہندوستان پر قبضہ کرنے کی حکمت عملی میں مشغول تھی۔ چنانچہ افغانستان کی اہمیت فوجی اعتبار سے انگریزوں کی نظر میں بڑھ گئی۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کا محفوظ راستہ بہاولپور کے حکمران کے زیر اثر علاقے اور سندھ کے راستے کے ذریعہ ہی ممکن تھا۔ کیونکہ پنجاب پر سکھ حاکم تھے، اور انگریز حکمت عملی فی الوقت ان سے جنگ کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ بہاولپور کے راستے ان کا کام زیادہ آسانی سے انجام دیا جا سکتا تھا، کیونکہ بہاولپور کا حکمران کئی اطراف سے حملوں کی زد میں تھا۔ پنجاب، جیسلمیر، اور سندھ کے حاکم اس کے لیے مسلسل خطرہ تھے۔ انگریزوں کو یقین تھا کہ افغانستان پہنچنے کے لیے پنجاب کے سکھ حکمران کی نسبت سندھ کے تالپور حکمران کو وہ باآسانی اپنے زیر اثر لا سکتے ہیں، اور ہوا بھی ایسا ہی۔ لیکن سندھ تک پہنچنے کا آسان اور قریب ترین ذریعہ بہاولپور ہی ہو سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہاول خان دوئم بھی اپنے لیے کسی مددگار کی تلاش میں تھا جو اسے قرب و جوار کے حاکموں کی دستبرد سے بچا سکے۔ چنانچہ ۱۸۰۸ء میں جب انگریزوں کا ایک گروہ بہ سرکردگی ماؤنٹ الیسٹوارٹ الفنسٹن (۱۸۵۹ء ـ ۱۷۷۹ء) اور جان اسٹریچی (۱۹۰۷ء ـ ۱۸۲۳ء) افغانستان جانے کے لیے بیکانیر، مارواڑ کے راستے بہاولپور کی حدود میں داخل ہوا تو بہاول خان نے ان کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور یہ اسوقت تک جاری رہی جب تک یہ لوگ بہاولپور کی حدود میں رہے [25]۔ یہ وہ وقت معلوم ہوتا ہے، جب بہاول خان دوئم نے انگریزوں سے معاہدہ دوستی کے لیے راہ ہموار کی۔

ہندوستان کے بگڑے ہوئے سیاسی حالات کا بہاول خان کو بخوبی علم رہا ہوگا۔ اور وہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بھی لاعلم نہ تھا۔ چنانچہ دوستی کی یہ خواہش غیر فطری نہ تھی۔ اس کے برعکس یہ فیصلہ بہاول خان دوئم کی سیاسی دور اندیشی کو ظاہر کرتا ہے۔ گو یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریز کو اس وقت بہاولپور سے معاہدہ کی ایسی کوئی جلدی نہ تھی، لیکن جب ضرورت ہوئی تو اس نے معاہدہ کرنے میں دیر بھی نہ کی۔ اس معاہدہ کی انگریزوں کو اس وقت ضرورت محسوس ہوئی، جب انہوں نے سندھ کو مکمل طور پر اپنے زیر اقتدار لانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ وہ وقت تھا جب افغانستان برطانوی ہندوستان کی حکمت عملی کا ایک لازمی اور اہم جزو بن گیا۔ چنانچہ بہاولپور اور

انگریزوں کے مفادات کی اس وقت کی نگران ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین یہ معاہدہ دوستی بہاول خان کے ہم نام ایک جانشین بہاول خان سوئم (۱۸۵۲ء - ۱۸۲۵ء) کے درمیان فروری ۱۸۳۳ء میں عمل میں آیا[۲۶]۔

اس بات کی طرف پہلے ہی اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ بہاول خان دوئم کا دور بہاولپور کی آزاد ریاست کی تشکیل کا دور ہے اور بہاول خان دوئم اس کا پہلا حکمران تھا۔ یہ رائے حقیقی اسباب پر مبنی ہے۔ یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس سے قبل عباسی یا داؤد پوترہ سردار کی حیثیت ایک مقامی بااثر فرد سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن بہاول خان دوئم کے وقت سے ان کی اس حیثیت میں قابل قدر تبدیلی واقع ہوئی۔ اس کا سرسری اندازہ تو اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بہاول خان نے اپنی حکمت عملی سے نہ صرف پنجاب کے سکھ حکمران، بلکہ ڈیرہ غازی خان کے مقامی حاکم اور بیکانیر و جیسلمیر علاقوں کے ہندو حکمرانوں سے اپنی آزاد حیثیت کو منوا لیا۔ اور ان میں سے ہر ایک اپنے مخالفوں کے خلاف بہاولپور کی حمایت و ہمدردی کا متمنی رہنے لگا اس سے بھی اہم تبدیلی جو بہاول خان دوئم کے دور میں واقع ہوئی اور اس کی آزاد حیثیت پر مہر ثبت کرتی ہے وہ کابل کے افغان حکمران اور دہلی کے مغل شہنشاہ سے خطابات حاصل کرنا ہے۔ مزید یہ کہ بہاولپور نے آزاد ریاست کی حیثیت سے اپنا سکہ بھی بہاول خان دوئم ہی کے زمانے میں جاری کیا۔

بہاول خان دوئم کے دور پر گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی جانشینی کے فوراً بعد ہی اس نے اپنے علاقے کے نظم و نسق میں استحکام پیدا کرنے اور اپنی حیثیت کو مضبوط کرنے کے لئے اقدامات کرنا شروع کر دیئے تھے۔ ایک طرف تو اس نے اپنے مخالفین کے خلاف کامیابیاں حاصل کیں، اور دوسری طرف "شادیوں" کو اپنے علاقے کی توسیع کا ذریعہ بنایا۔ پھر حکومت کا نظم و نسق چلانے کے لیے ذمہ داریوں کا تعین کیا۔ اور اس ضمن میں بہاول خان دوئم نے وزیر اور مختار مقرر کیئے۔

کچھ مصنفین[۲۷] کے مطابق بہاول خان دوئم یا اس کے بیٹے مبارک خان[۲۸] جس کی پیدائش ۱۷۷۲ء کی ہے، نے ۱۷۷۹ء میں ایک شخص کاظم علی خان بارہیہ کو بادشاہ دہلی شاہ عالم کے دربار میں بھیجا تاکہ وہاں سے بہاولپور کی حمایت میں کوئی سند لائے۔ بہاولپور کے اس نمائندے کو دربار دہلی

میں عزت دی گئی اور بادشاہ شاہ عالم (۱۸۰۶-۱۷۵۹) نے بہاول خان دوئم کے نام ایک فرمان بھی جاری کیا۔ جس کے ذریعہ اسے "رکن الدولہ حافظ الملک نصرت جنگ" کے خطابات سے نوازا گیا[۲۹]۔ یہ بیان کہ بہاول خان یا مبارک خان نے کاظم علی کو دہلی دربار میں بھیجا صحیح معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ مبارک تو اس وقت صرف سات سال کا تھا، نیز کاظم علی کا تعلق اس وقت بہاولپور سے بالکل نہیں تھا۔ زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ بہاول خان نے دربار دہلی سے کسی قسم کی اعانت ومدد کی درخواست کسی کے ذریعہ کی ہوگی۔ جس کے جواب میں بادشاہ دہلی نے، جو اب نام کا بادشاہ تھا، یہ غنیمت جانتے ہوئے کہ ملک کے ایک دور افتادہ علاقے میں کسی کے نزدیک اب بھی اس کی کچھ عزت و وقعت ہے، یہ درخواست قبول کرتے ہوئے اپنے ایک درباری سید کاظم علی خان کو خلعت اور انعام واکرام دے کر بہاول خان کی خدمت میں بھیجا۔

واضح رہے کہ کاظم علی کا تعلق دربار دہلی کے دو بھائیوں حسین علی (وفات - ۱۷۲۰ء) اور عبداللہ خان (وفات ۱۷۲۳ء) سے تھا، یہ دونوں بارھہ کے مشہور خاندان سے تھے اور دربار دہلی میں کافی اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ کچھ عرصہ بعد یہی کاظم علی، جب دہلی کے حالات مسلسل خرابی کا شکار تھے، اپنے ایک اور ساتھی میر بخش علی کے ہمراہ بہاولپور چلا آیا تو بہاول خان دوئم نے ان کو اپنے یہاں اچھے مشاہرہ پر نوکر رکھ لیا[۳۰] تقریباً اسی دوران (۱۸۰۰ء - ۱۷۹۹ء) جب دربار دہلی سے بہاول خان کو خلعت اور خطابات سے نوازا گیا، افغانستان کے حکمران شاہ محمود یا محمد (۱۸۰۳ء - ۱۷۹۹ء) کی طرف سے بھی اسے "مخلص الدولہ" کا خطاب اور انعام واکرام موصول ہوئے[۳۱]۔

ان تمام واقعات سے واضح ہے کہ بہاول خان دوئم کی حیثیت قرب وجوار کے حاکموں کے نزدیک ہی نہیں بلکہ دور افتادہ افغان اور دہلی کے حکمرانوں کے نزدیک بھی اہمیت اختیار کر گئی تھی غالباً یہی وجہ ہے کہ بہاول خان نے موقعہ کی مناسبت سے ضروری سمجھا کہ اب اپنی ٹکسال بھی قائم کرے، کیونکہ ایسا کرنے سے اس کی آزاد حیثیت کو مزید تقویت مل سکتی تھی اور ملی بھی چنانچہ (۱۸۰۱ء، یا ۱۸۰۲ء) میں اس نے بہاولپور سے سونے، چاندی اور تانبے کے سکے جاری کئے۔ ان سکوں کے ایک طرف "دارالسرور بہاولپور" اور دوسری طرف "ھمایوں شاہ محمود" کنداں تھا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ بہاولپور نے اپنی ٹکسال قائم کر کے سکے جاری کئے گو ان سکوں پر بہاولپور

کے حکمران کا نام نہیں تھا۔ لیکن ان کے اجراء سے یہ اہم ثبوت ملتا ہے کہ بہاولپور دہلی سے زیادہ کابل کے حکمران کے زیر اثر تھا۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ اس وقت افغانستان کے جنوب کا یہ علاقہ دہلی سے زیادہ کابل کے زیر اثر تھا۔

ہندوستان کے بگڑتے ہوئے سیاسی حالات کا مختصر سا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ صورت حال مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کی ۱۷۰۷ء میں وفات کے بعد سے شروع ہو گئی تھی لیکن "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کے مصداق مسلمان حکمران اور ان کے امراء اپنے ذاتی مفادات اور آپس کی رنجشوں کی وجہ سے حالات کو سدھارنے میں ناکام رہے۔ نتیجہ اسکا یہ ہوا کہ دہلی کی مرکزی مسلم حکومت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی اور ملک کے مختلف صوبوں اور علاقوں میں اس جگہ کے حاکم یا صوبہ دار نے آزاد و خود مختار حکمران کا روپ دھار لیا۔ انیسویں صدی میں مسلمان مرکزی حکومت کے تار و پود بکھر کر رہ گئے۔ مسلمانوں کو تو اس کا فائدہ کچھ زیادہ نہ ہوا لیکن ملک کے مختلف حصوں پر آہستہ آہستہ ہندو اور انگریز قابض ہوتے گئے۔ کہیں کہیں حکومت مسلمانوں کے ہاتھ بھی آئی جیسے بہاولپور میں۔ جب دہلی اور اس کے گرد و نواح میں حالات مزید خراب ہوئے تو بہت سے مسلمانوں نے زیادہ محفوظ علاقوں کی طرف رخ کیا۔ اس ہجرت کے دو مقاصد تھے۔ ایک سماجی دوسرا معاشی۔

کیونکہ مسلمانوں کی سیاسی قوت پورے ملک ہندوستان میں انحطاط کا شکار تھی جس کی وجہ سے بہت سے مسلمانوں کی حیثیت کو صدمہ پہنچا۔ ان کی اپنے علاقے میں کوئی عزت و وقعت نہ رہی جب کوئی معاشرہ زوال پذیر ہوتا ہے تو صورت حال یہی کچھ ہوا کرتی ہے۔ حکمران طبقہ نہ صرف اپنی اہمیت کھو بیٹھتا ہے بلکہ قوم کی معاشی حالت بھی ایسے حالات میں بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ ان حالات سے مجبور ہو کر بہت سے لوگ نقل مکانی کو عزت و کامرانی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اٹھارویں صدی کے آخر میں دہلی اور دیگر مسلمانوں کے سیاسی مراکز سے بہت سے باکمال لوگ اپنے اپنے علاقوں کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے دوسری جگہوں پر چلے گئے ان میں سے ایک بہاولپور بھی تھا۔

بہاول خان دوئم کے دور کی اور دوسری اہم باتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے زمانے میں دہلی، لاہور، ملتان اور ڈیرہ غازی خان کے علاقوں سے بہت سے افراد نے یہاں آکر رہائش اختیار کی اور بہاول خان نے اس میں سے بہت سے لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز کیا[۳۲]۔ میر کاظم

علی اور میر بخش کو جو بارھ کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے اور جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ بہاول خان نے نہ صرف اپنے یہاں ملازمت دی بلکہ اکثر ان کو اپنی مشاورتی کونسل میں بھی شامل کیا۔ پنجاب میں جب سکھوں نے طاقت پکڑی تو لاہور سے بھی مسلمانوں نے بہاولپور آنا شروع کر دیا۔ ایسے لوگوں میں کچھ نام زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، مثلاً مولوی فضل اسلام اور حفیظ الاسلام۔ آخر الذکر کو تو بہاول خان نے تفسیر اور حدیث پڑھنے کے لیے خود اپنا استاد مقرر کر لیا۔ اور ایک موقعہ پر جب بہاول خان کو اپنی مملکت میں اپنے حواریوں کے ہاتھوں مصیبت و پریشانی کا سامنا تھا، اس نے حفیظ الاسلام کو اس ہدایت کے ساتھ حج پر روانہ کیا کہ مکہ مکرمہ جا کر اس کے معاملات کے بہتر ہونے کی دعا کریں [۳۳]۔

ہندوؤں کے ساتھ بھی بہاول خان کا سلوک بہت اچھا تھا۔ چنانچہ گنگا دھر، جو ملتان پر مرھٹوں کے حملے کے بعد وہاں کا دیوان بن گیا تھا، اپنے تین بیٹوں کے ساتھ اور دوارامل، جو ڈیرہ غازی خان میں دیوان کے عہدہ پر فائز رہ چکا تھا، جب اپنے اپنے علاقوں سے کسی وجہ سے نکل کر بہاولپور آگئے تو بہاول خان ان سے اچھی طرح پیش آیا [۳۴]۔ ان کے علاوہ بھی اس کے دور میں دوسرے ہندو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔ چنن رائے جس کی تحویل میں بہاول خان کی اپنی خاص مہر رہتی تھی اور وہ حکومت کے معاملات میں مشورہ بھی دیتا تھا۔ گسائیں بہار رائے جسے بہاول خان نے اپنا سفیر بنا کر مظفر خان گورنر ملتان کے پاس بھیجا۔ اور اس کے بعد ایک اور ہندو جیون رام منشی کو پانچ ہزار سواروں پر مشتمل فوج دے کر مظفر خان کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ دیوان سلامت رائے کو بھی جو پہلے اُچ کے مخدوم حامد بخش کے ہاں ملازم تھا۔ بہاول نے اپنی ملازمت میں لے لیا۔ اس کے علاوہ ایک اور ہندو دولت رائے کو بہاول خان نے اپنی ملازمت میں لے کر اپنا سفیر بنا کر کابل میں شاہ شجاع (۱۸۰۹ء۔۱۸۰۳ء) کی خدمت میں روانہ کیا اس کے بعد ایک اور سفارت وہاں ہی کے لیے منشی صبح رائے کی سربراہی میں روانہ کی [۳۵] اس سے پہلے بہاول خان کے سیکریٹری دھنپت رائے کا ذکر ہو چکا ہے، جس کے ذریعہ اول الذکر نے رنجیت سنگھ کو تحائف بھیجے تھے۔

ان تفصیلات سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ مذہب کی بنیاد پر بہاولپور میں کسی سے تفریق

نہیں برتی جاتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں کو یہاں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور مناصب کی تقسیم کے موقعہ پر انہیں زیادہ سے زیادہ عہدوں سے نوازا جاتا تھا۔ خود مبارک خان (۱۷۷۲ء۔۱۷۴۹ء) کے زمانے میں اس کا اہم عہدہ دار لال داس تھا[۳۶]۔ صادق محمد خان سوئم (۱۸۵۳ء۔۱۸۵۲ء) گو مختصر مدت تک حکمران رہا لیکن اس کے زمانے میں معلوم ہوتا ہے، پوری حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ منشی جوکس رائے اس کا وزیر تھا۔ اور سلامت رائے توشہ خانے کا سرپرست، میر منشی کے عہدہ پر خان چند متعین تھا۔ یہ چوکس رائے کا بھائی تھا[۳۷]۔ بعد کے دور میں بھی یہی صورت حال تھی۔

بہاولپور کی تاریخ بہاول خان دوئم کے زمانے میں کچھ اور وجوہات سے بھی اہمیت رکھتی ہے اس دور میں شمالی ہند اور ہندوستان کے دوسرے علاقے کی بہت سی شخصیات کو بہاولپور میں قیام کرنے یا اس علاقے کو اپنی گذرگاہ کے طور پر استعمال کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ بہاول خان نے ان سب سے اعلیٰ درجہ کا سلوک کیا۔ اس کا فائدہ علاوہ دیگر باتوں کے ایک یہ ہوا کہ اپنے قیام کے ابتدائی زمانے سے ہی بہاولپور کا تعلق دور دراز کی دوسری ریاستوں سے بھی پیدا ہو گیا۔ مثلاً اس کے دور میں غلام محمد خان جو شمالی ہند کی ایک ریاست رام پور کے بانی فیض اللہ خان (۱۷۹۴ء۔۱۷۷۴ء) کا چھوٹا بیٹا تھا کابل جاتے ہوئے بہاولپور سے گزرا۔[۳۸] اس کے سفر کا مقصد کابل کے حکمران زمان شاہ کی حمایت حاصل کرنا تھا۔ کیونکہ فیض اللہ کی وفات کے بعد اس کے دونوں بیٹوں محمد علی خان اور غلام محمد خان میں جھگڑا ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں محمد علی مارا گیا۔ لیکن بجائے اس کے کہ غلام محمد کو اس کا فائدہ پہنچتا انگریزوں اور اودھ کے حکمرانوں نے محمد علی کے بیٹے احمد علی (۱۸۳۹ء۔۱۷۹۴ء) کو رام پور کی حکومت سونپ دی۔ ایسے میں غلام محمد نے کابل کی مدد چاہی جس میں وہ ناکام رہا۔ شہامت علی نے غلام محمد کو احمد علی خان کا بڑا بھائی لکھا ہے جو غلط ہے[۳۹]۔ شہامت علی کے مطابق اسی دوران جب رام پور کی جانشینی کے جھگڑے کو طے کرانے کے لیے غلام محمد خان کابل جاتے ہوئے بہاولپور سے گذرا۔ اودھ کے حکمران آصف الدولہ (۱۷۹۷ء۔۱۷۷۵ء) کا ایک ایجنٹ بھی خراسان جانے کے لیے بہاولپور کے راستہ سے گذرا اور یہاں قیام کیا۔ اس ایجنٹ کا مقصد آصف الدولہ کی طرف سے درانی / خراسانی حکمران کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دینا تھا[۴۰]۔ مرہٹوں کے

ایک سردار مادھو جی سندھیا (۱۷۹۴ء - ۱۷۵۹ء) کے دربار سے دو افراد پر مشتمل ایک وفد بھی کابل جاتے ہوئے بہاولپور سے گذرا تو ان کے قیام کے دوران بہاول خان دوئم نے انہیں ہر طرح کی آسائش بہم پہنچائی - ان دو میں سے ایک مادھو جی کے دربار کا ایک امیر نواب ذوالفقار خان تھا - اور دوسرا غلام محمد پاپلزئی جو درانی حکمران کا سفیر مادھو کے دربار میں مقرر تھا[۴۱] - انگریزوں کے وفد کی آمد اور ان کے استقبال کا ذکر پہلے ہو چکا ہے -

بہاول خان دوئم کا دور جہاں ریاست کے قیام اور استحکام کا دور ہے وہاں خاندانی اختلاف، آپس کی اور غیروں کے ساتھ جنگ اور سازشوں کا دور بھی رہا جس کی وجہ سے خود بہاول کی زندگی کو بھی خطرات کا سامنا کرنا پڑا - ان واقعات پر کچھ روشنی پہلے ڈالی جا چکی ہے، جس کا اعادہ یہاں ضروری نہیں - تاہم ان خطرات اور سازشوں پر قابو پانے کے لیے بہاول خان نے جن حکمت عملیوں کو اپنایا ان میں سے ایک کا ذکر ضروری ہے - اور وہ ہے مملکت کے باہر کے لوگوں پر مشتمل فوجیوں کی بھرتی - چنانچہ اٹھارویں صدی کے اختتام سے ذرا پہلے ۱۷۱۸ء میں اس نے اپنی اور مملکت کی حفاظت کے لیے ایک ایسی فوج کی تشکیل کی جو پٹھانوں، سکھوں اور "ہندوستانیوں" پر مشتمل تھی[۴۲] پٹھانوں اور سکھوں کی خصوصیات سے تو بہاول خان ناواقف نہ رہا ہوگا - کیونکہ اسے اور اسکے پیشروؤں کو ان گروہوں سے پہلے ہی واسطہ پڑ چکا تھا، اکثر و بیشتر ان سے جنگ وجدل بھی رہتی تھی - لیکن یہ "ہندوستانی" کون تھے؟ دراصل یہ بھی پٹھان ہی تھے لیکن شمالی ہند میں یہ "روہیلے" کہلاتے تھے اور حافظ رحمت خان (۱۷۷۴ء - ۱۷۶۳ء) ان کا مشہور فوجی رہنما تھا - اٹھارویں صدی میں انہوں نے اپنی جنگجویانہ صلاحیتوں کی بناء پر شمالی ہند میں خوب نام کمایا اور وہاں ایک علاقہ آج بھی روہیل کھنڈ کے نام سے موسوم ہے - ریاست رام پور جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اسی قبیلے کے ایک فرد نے قائم کی تھی -

ریاست رام پور کے ایک فرد غلام محمد خان نے کابل جاتے ہوئے بہاولپور میں قیام بھی کیا تھا - بہاول خان دوئم نے یقیناً اپنے مہمان سے روہیلوں کی فوجی اور انتظامی صلاحیتوں کے بارے میں سنا ہوگا - اور عین ممکن ہے کہ پہلے سے بھی اسے انکی بابت بہت کچھ علم ہو - چنانچہ اس نے مناسب سمجھا کہ اپنی فوج میں ان "ہندوستانیوں" کو بھی رکھے - شہامت علی نے انہیں ایک جگہ

"پوربیا" سپاہی کے نام سے روشناس کرایا ہے۔ جس نے ایک موقعہ پر بہاول خان دوئم کی جان بھی بچائی ان روھیلوں یا "پوربیا" سپاہیوں کے چار سو پر مشتمل ایک دستہ بہاول خان کی حفاظت پر مامور تھا [۴۳]۔ بہاول خان سوئم (۱۸۵۲ء-۱۸۲۵ء) کے دور میں معلوم ہوتا ہے، ان روھیلوں نے حکومت کے خلاف بغاوت بھی کی جس کی خاص وجہ کافی عرصے سے انہیں تنخواہوں کی عدم ادائیگی تھی۔ بعد ادائیگی تنخواہ روھیلوں کی یہ بٹالین توڑ دی گئی [۴۴]۔

بہاولپور کے حکمرانوں اور ریاست کی تشکیل و انتظام کی تاریخ پر روشنی ڈالنے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے سماجی و مذہبی حالات پر بھی تھوڑی سے روشنی ڈال دی جائے۔ ۱۸۰۸ء میں جب اسٹیوراٹ الفنٹس بہاولپور کے علاقے سے گذرا تو اس نے ریاست کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا [۴۵]۔

> جب ہم بہاولپور کے ایک ڈیڑھ میل کے حصے سے گذرے تو یہاں کی سڑکوں پر تماش بین کی بھیڑ نظر آئی جو ہمارے لیے کم دلچسپی کا باعث نہ تھی، صحرا کے مشرق کی طرف رہنے والوں اور یہاں کے لوگوں کے درمیان ہمیں ایک واضح فرق نظر آیا۔ جو لوگ یہاں نظر آئے وہ مضبوط جسم کالے رنگ سخت چہرے لمبی داڑھی اور سروں پر لمبے بال والے تھے۔ صافے کی جگہ سر پر ٹوپی اوڑھے ہوئے تھے۔ زبان ایسی بولتے تھے جو ہمارے ہندوستانی نوکروں کی سمجھ میں نہ آتی تھی... نفاست پسند لوگ بھی نظر آئے جن کا طور طریق ایرانی (مغل) تہذیب سے قریب تھا۔

بہاولپور شہر کے بارے میں الفنٹس نے لکھا ہے کہ

> یہ چار میل کے دائرے میں پھیلا ہوا ہے۔ آموں کے باغات بھی پائے جاتے ہیں۔ کچی اینٹوں کے مکانات ہیں.... یہاں کی لنگی مشہور ہے۔ اس جگہ اور شمال و مغرب میں بسنے والے زیادہ تر جاٹ اور بلوچ ہیں جو مسلمان ہیں۔ بہاولپور میں ہندوؤں کی بھی بڑی تعداد بستی ہے۔ ہم جتنے علاقوں سے اب تک گذرے ہیں۔ ان سب کی نسبت بہاولپور میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ پائی ہے [۴۶]۔

کرنل سی سی منچن نے، جو انیسویں صدی کی دوسری دھائی میں بہاولپور میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے، اور جن کے نام سے اس علاقے میں منچن آباد نام کا شہر آج بھی قائم ہے۔ ریاست کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے۔

بہاولپور اپنی جغرافیائی حدود کی وجہ سے ایک الگ تھلگ علاقہ بن کر رہ گیا ہے، اس نے پرانی تہذیب کو پناہ دے رکھی ہے۔ یہاں کے لوگوں میں قدیم رسم و رواج اب بھی محفوظ پائے جاتے ہیں۔ ریگستان اور خشک علاقے یہاں کی تہذیب و تمدن کی ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔"[۴۷]

ریاست کی بڑی آبادی سنی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ شعیہ اچ اور اس کے قریب احمد پور اور بہاولپور میں تھے۔ لیکن تعداد قلیل تھی سنی مسلمانوں میں شافعی مسلک کے بھی تھے جو اپنے آپ کو اہل حدیث کہتے تھے۔ لیکن دوسروں کے نزدیک وہ وہابی یا غیر مقلد کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان کی بڑی تعداد احمد پور شرقیہ میں رہائش پذیر تھی۔[۴۸] مسلمانوں میں سید اور مولوی قدر و منزلت کے مالک سمجھے جاتے تھے، لیکن یہ بھیک مانگنے میں بھی شرم محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان لوگوں میں خلاف اسلام بہت سی عادات پائی جاتی تھیں۔ لیکن پھر بھی اپنے کو کٹر مذہبی مسلمان سمجھتے تھے۔ صوفی اپنے مریدوں کی آمدنی پر گذارہ کرتے تھے۔ ریاست میں تعزیہ بنانا، مجلس منعقد کرنا۔ محرم کے ایام میں جلوس نکالنا، سختی سے منع تھا اور یہ ناقابل معافی جرم تھا، ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست میں عیسائیوں کی تعداد ۸۳ تھی جن میں سے صرف چھ عدد مقامی تھے، باقی یورپین یا یوریشین تھے۔ ان کا اپنا کلیسا اور اسکول تھا جو ۱۸۶۶ء میں قائم کیا گیا تھا[۴۹]۔

ریاست کی طرف سے ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے مذہبی مقامات کے لیے مالی امداد بھی فراہم کی جاتی تھی۔ اس قسم کی امداد صرف ریاست کے اندر ہی مہیا نہیں کی جاتی تھی، بلکہ ریاست کے باہر کے ادارے بھی اس سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ امداد کی یہ منظوری نواب کی طرف سے ہوتی تھی۔ ریاست کے باہر کے علاقوں میں لاہور، امرتسر، سہارنپور، دہلی، اجمیر اور ملتان کے ادارے شامل تھے۔ انیسویں صدی کے آخر میں ریاست کے اندر اور باہر جو مالی امداد دی گئی وہ بالترتیب ۵۲۳۹ روپیہ اور ۔/ ۲۲۵۸ روپیہ تھی[۵۰]۔ بہاولپور کے مشن اسکول کو علیحدہ سے ۔ ۱۲۰۰ روپے سالانہ امداد مہیا کی جاتی تھی[۵۱]۔ صادق محمد خان دوئم کے عہد میں ریاست کے سکے، جسے احمد پوری روپیہ کہتے تھے، کی شرح تبادلہ یہ تھی۔ ۱۰۰ انگریزی روپیہ برابر تھے ۱۶۰ احمد پوری روپیہ کے[۵۲]

بہاولپور میں مسلمان زیادہ تر زراعت پیشہ تھے۔ ان لوگوں کی بڑی تعداد کم آمدنی کے باوجود

زیادہ اخراجات کرنے کی عادت کی شکار تھی۔ان میں وہ مسلمان بھی شامل تھے جو جاگیر دار اور سجادہ نشین تھے۔ باوجود اس کے کہ ریاست کی طرف سے انہیں مالی امداد بھی ملتی تھی، پھر بھی یہ غربت کا شکار رہتے تھے [۵۳] اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ریاست میں مسلمانوں کی معاشی حالت ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ خراب تھی۔اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مسلمان زیادہ تر کچے مکانات میں رہتے تھے۔ہندوؤں کے مکانات پکے کئی منزلہ اور آرائش شدہ ہوتے تھے [۵۴]۔

تعلیم کے معاملے میں بھی مسلمانوں کی حالت ہندوؤں کے مقابلے میں بہت خراب تھی۔ کیونکہ مسلمان تعلیم کی طرف کم رغبت رکھتے تھے،اس کی ایک وجہ ان کی غربت بھی ہو سکتی ہے۔ اسکولوں میں ہندو بچوں کی تعداد مسلمان بچوں سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔یہ ہندو طلباء اسکول سے لے کر کالج تک میں پائے جاتے تھے [۵۵] ریاست میں استعمال ہونے والی زبان جو تعلیم یافتہ طبقہ کام میں لاتا تھا وہ اردو زبان تھی۔اور مقامی بولی میں لکھی جانے والی چیزوں کے لیے بھی اردو رسم الخط ہی استعمال ہوتا تھا۔ہندو البتہ اردو سے گریز کرتے تھے [۵۶]۔

انگریزی عمل دخل سے قبل ریاست کا عدالتی نظام کسی حد تک مذہبی بنیادوں پر قائم تھا۔ دیوانی مقدمات غیر مذہبی بنیادوں پر طے کیے جاتے تھے۔چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹنا شامل تھا۔چور چاہے مسلمان ہو یا ہندو تاہم مجرم اگر جرمانہ ادا کرنے پر تیار ہوتا تھا جسے "چٹی" کہتے تھے۔تو ہاتھ کاٹنے کی سزا موقوف ہو سکتی تھی [۵۷] غالباً پورے ہندوستان میں ریاست بہاولپور وہ واحد جگہ تھی، جہاں عدلیہ انتظامیہ سے آزاد تھی [۵۸]۔ریاست کی عدالتوں میں وکیلوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کیونکہ خیال کیا جاتا تھا کہ وکیلوں اور بیرسٹروں کی موجودگی لوگوں میں عدالتی چارہ جوئی کی خراب عادات پیدا کر دے گی۔جس کے نتیجے میں لوگ غربت کا شکار ہو جائیں گے۔تاہم مقدمہ دائر کرانے کیلئے عدالت کے باہر عرضی نویس مہیا کیے گئے تھے۔جنہیں حکومت کی طرف سے مناسب تنخواہ ملتی تھی [۵۹]۔

ریاست میں ہندو اور یورپین تجارت پر چھائے ہوئے تھے، کیونکہ مسلمان محنت سے کمانے کو برا سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت کے فوائد سے ہندو اور غیر مسلم بے انتہا فیض یاب ہوئے۔ تجارت زیادہ تر کپاس اور گندم پر مشتمل تھی لیکن دوسری روزمرہ استعمال کی اشیاء بھی شامل تھیں۔

سن ۰۳-۱۹۰۲ء میں ایک یورپی کمپنی سینڈی پیٹرک نے بالترتیب ۶۰۰، ۲۹۹ من اور ۷۴۰، ۲۷۸ من گندم یہاں سے خرید کیا۔ ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۴ء کے درمیان ریلی پرادرس (یہ کمپنی غالباً اب بھی پاکستان میں تجارت کا کام کرتی ہے) ۸۱۷، ۴۰۱ من گندم اور ۱۸۵۴ من چنا ریاست سے باہر بھیجا[۶۰] اسی طرح جب ۱۸۹۵ء میں ریاست میں آٹا ملیں لگائی گئیں تو ہندوؤں نے اس کام کے لیے پہلا قدم اٹھایا، اور سیٹھ چمن سنگھ اور گلاب سنگھ نے شکارپور سے آکر یہاں اس کی ابتداء کی۔ کپاس اور چاول صاف کرنے کے کارخانے بھی ہندوؤں نے قائم کئے۔ اس سلسلے میں پرشوتم داس نے خانپور اور الہ آباد میں کارخانے ۱۹۰۲ء میں اور مصری رام نرائن نے ایک کارخانہ خانپور میں قائم کیا۔ یہ جیسلمیر سے آیا تھا[۶۱]۔

یہ تھا مختصر سا جائزہ معاشی اور سماجی حالات کا جو بہاولپور میں انیسویں صدی اور بیسویں صدی کی ابتداء میں پایا جاتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ریاست کے اندر دور رس تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ لیکن اس زمانے کے اثرات بہت سی جگہ اب بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ جیسے مشن اسکول جو اب پہلے سے کہیں زیادہ ترقی کر گیا ہے اور ایک وسیع وعریض علاقہ پر قائم ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد عزیز الرحمن عزیز، صبح صادق: بہاول پور ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۴۳ء، ص ۶

۲۔ Shahamat Ali, The History of Bahawalpur، لندن، ۱۹۴۸ء، ص ۱؛

محمد غلام سرور قریشی، گلزار شاہی، لاہور، ت، ن، ص ۲۵۷

۳۔ محمد عزیز الرحمن عزیز، بحوالہ سابقہ، ص ص ۳-۶۲

۴۔ رفیق احمد صدیقی، خان پور کٹورہ، ایک عہد ساز شہر، بحوالہ بانگ سحر: پچیس سالہ تاریخ نمبر ۱۹۶۵ء۔ ۱۹۹۰ء خانپور، ۱۹۹۲ء، ص ۸۰

۵۔ ایضاً

۶۔ شہامت علی، بحوالہ سابقہ، ص ۱۹۵

۷۔ Stanely Jackson, The Agha Khan، لندن، ۱۹۵۲ء؛

غلام سرور قریشی، بحوالہ سابقہ ۸۔ شہامت علی، بحوالہ سابقہ، ص ۱۸۳۔ ۱۸۷

۹۔ ایضاً، ص ۲۱

۱۰۔ محمد عزیز الرحمن عزیز، بحوالہ سابقہ، ص ۷۵
۱۱۔ شہامت علی، بحوالہ سابقہ، ص ۳۰
۱۲۔ ایضاً، ص ۳۶، محمد عزیز الرحمن عزیز، ص ۸۳
۱۳۔ شہامت علی، بحوالہ سابقہ، ص ۱۸۷
۱۴۔ ایضاً
۱۵۔ Punjab States Gazetteer: Bahawalpur State, Vol.34A ، لاہور، ۱۹۰۴ء، ص ۵۴: محمد عزیز الرحمن عزیز، بحوالہ سابقہ، ص ۸۳: مرزا محمد اشرف گورمانی اور محمد دین، صادق التواریخ، بہاولپور، ۱۸۸۹ء، ص ۱۵۵
۱۶۔ محمد عزیز [illegible] عزیز، بحوالہ سابقہ، ص ۸۳
۱۷۔ شہامت علی، [illegible] سابقہ، ص ۴۸
۱۸۔ ایضاً، ص ص ۱۸۸، ۵۲، ۴۷-۴۷
۱۹۔ پنجاب سٹیٹس گزٹیئر، بحوالہ سابقہ، ص ۵۶
۲۰۔ میر علی شیر قانع تحفۃ الکرام، مترجم، اختر رضوی، کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ص ۳۷، ۳۵
۲۱۔ شہامت علی، بحوالہ سابقہ، ص ۴۷
۲۲۔ گزٹیئر، بحوالہ سابقہ ص ۵۶
۲۳۔ شہامت علی، بحوالہ سابقہ، ص ص، ۱۳۰، ۱۲۸
۲۴۔ ایضاً، ص ۵۷
۲۵۔ ایضاً، ص ص ۱۹۵، ۱۴۶، ۱۴۲
۲۶۔ ایضاً، ص ۲۱۹، ۲۲۲
۲۷۔ مرزا محمد اشرف گورمانی و مولوی محمد دین، بحوالہ سابقہ، ص ۱۹۳
۲۸۔ شہامت علی، بحوالہ سابقہ، ص ۶۴
۲۹۔ ایضاً
۳۰۔ ایضاً، ص ص ۸-۵۷
۳۱۔ ایضاً، ص ۱۰۲
۳۲۔ پنجاب سٹیٹس گزٹیئر، بحوالہ سابقہ، ص ۶۱
۳۳۔ شہامت علی، بحوالہ سابقہ، ص ص ۹-۵۸
۳۴۔ ایضاً، ص ۵۸
۳۵۔ ایضاً، ص ص ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۱۸، ۱۱۵، ۱۱۴، ۸۰

۳۶۔ ایضاً، ص ۴۹

۳۷۔ محمد عزیز الرحمن عزیز، بحوالہ سابقہ، ص ۱۱۲

۳۸۔ شہامت علی، بحوالہ سابقہ، ص ۸۹

۳۹۔ ایضاً، ص ۸۹

۴۰۔ ایضاً، ص ۸۹

۴۱۔ ایضاً، ص ۸۶

۴۲۔ مرزا محمد اشرف گورمانی و مولوی محمد دین، بحوالہ سابقہ، ص ۱۸۶

۴۳۔ ایضاً، ص ۲۰۱

۴۴۔ گزٹیئر، بحوالہ سابقہ، ص ص ۸۔ ۶۷

۴۵۔ اسٹیوراٹ الفنسٹن، پنجاب سٹیٹس گزٹیئر، بحوالہ سابقہ، ص ص ۵۶۔ ۳۵۵

۴۶۔ ایضاً

۴۷۔ ایضاً، ص ۸۹

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۴۹۔ پنجاب سٹیٹس گزٹیئر، بحوالہ سابقہ، ص ص، ۱۹، ۳۵۸

۵۰۔ ایضاً، ص ص ۴، ۱۸۳

۵۱۔ ایضاً، ص ۳۵۸

۵۲۔ ایضاً، ۶۶

۵۳۔ ایضاً، ص، ۲۳۵

۵۴۔ ایضاً، ص ۲۰۴

۵۵۔ ایضاً، ص ۳۴۳

۵۶۔ ایضاً، ۳۴۴

۵۷۔ ایضاً، ص ۲۸۴

۵۸۔ ایضاً، ص ۲۸۵

۵۹۔ ایضاً، ص ۲۹۰

۶۰۔ ایضاً، ص ۲۷۴

۶۱۔ ایضاً، ص ۲۷۱